ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

لکھنوی تہذیب وثقافت کا عمومی جائزہ

A general overview of Lucknow civilization and culture

عثمانیہ سلطانہ

پی ایچ دی سکالر، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

صدر شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Absract:

Ajodhya, an old city of Hindustan, is known as "Awaddh". Which first capital (in Nawaban-e-Awaddh age)was Faiazbad and then after Nawab Asifuddaulah's arrival in Likhnow remained its capital. Nwaban-e-Awaddh were Ahl-e-Tashyuh. Nawaban-e-Awaddh (Nwab Asifuddoulah and after that till last Nawab Wajid Ali Shah) were fond of Literature so they oblidged Literary persons, like, Mushafi, Jura,at, Rangeen, Meer, Sauda, Insha, Nasikh Aatish etc. These poets set the foundation of a new Urdu school of thought which is called "Dabistan-e-Likhnow". This school of thought is different from "Dabistan-e-Delhi" in different literary qualities. "Dabistan-e-Likhnow" has some values and qualities in its literature which are narrated in below lines.

Keywords:

India, Ayodhya, Lucknow Civilization, Sanskrit, Bin Bas, Kingdom of Kosala, Lakshman, Lakshmavati, Lakshampur, Lakhanpur, Lakhan Qila, Lakhan Ahir, Lakhan Pasi, Lakshmi, Lakshmanavati, Lakshmanavat

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر اجودھیا جس کی دیرینہ تاریخ رامائن میں موجود ہے، اودھ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ سنسکرت زبان یہ لفظ ''وعدے یا پیمان'' کے معنی میں آتا ہے جو دراصل رام چندر جی کے ایفائے عہد کی جانب ایک اشارہ ہے۔ ان کے بن باس کے بعد اجودھیا عام طور پر اودھ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ بعدازاں پورا صوبہ ہی اودھ کے نام سے موسوم ہو گیا جس کا مرکز اجودھیا تھا۔ اسلامی عہد سے اودھ وہ صوبہ ہے جو دریائے گنگا کے سرسبز وزرخیز میدان کا ایک وسطی حصّہ ہے جس کا رقبہ تقریباً تئیس ہزار نو سو تیس (۲۳۹۳۰۳) مربع میل ہے۔

زمانۂ قدیم میں لکھنؤ ''مملکتِ کوسل'' کا حصہ تھا۔ قدیم ہندو روایتوں کے مطابق رام نے اپنی وراثت کو اپنے بھائی لکشمن کے سپرد کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ''لکشماوتی''، ''لکشم پور'' یا ''لکھن پور'' جیسے ناموں سے جانا اور پہچانا گیا جو بعدازاں بدل کر ''لکھنؤ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں سے ایودھیا کی مسافت ۸۰ میل ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس شہر کا نام ''لکھن قلعہ'' کے اہم فنکار ''لکھن اہیر'' کے نام پر رکھا گیا۔ مگر دلت اسے علاقے کے دلت حکم ران ''لکھن پاسی'' کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اس علاقے کو ''لکھن پور'' کہا جاتا تھا جو گیارہویں صدی میں ''لکھنؤ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ایک اور مفروضہ بھی موجود ہے جس کے مطابق شہر کا نام دولت کی ہندو دیوی لکشمی کے نام پر ''لکشمناوتی'' سے ''لکشمناوت'' اور آخر کار ''لکھنؤ'' ہو گیا۔

۱۳۵۰ء کے بعد سے سلطنت دہلی، سلطنت جونپور، مغلیہ سلطنت اور نواب اودھ، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی راج کے دوران لکھنؤ ریاستِ اودھ میں شامل رہا ہے۔ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء کے دوران لکھنؤ کا شمار بڑے مراکز میں ہوتا تھا۔ ۱۷۱۹ء تک اودھ مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ رہا۔ اس کا گورنر برہان الملک سعادت علی خان تھا جس نے لکھنؤ کے قریب فیض آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ (۱۳۹۴ء سے ۱۴۷۸ء تک) اودھ، تقریباً چوراسی سال سلطنت جونپور کا حصہ رہا۔ ۱۵۵۵ء کے لگ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

بھگ مغل شہنشاہ ہمایوں نے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اسے اپنے ایک پسندیدہ شاہی افسر شیخ عبدالرحیم کو جاگیر کے طور پر عطا کیا جو بعد ازاں اس کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

فیض آباد اور لکھنؤ میں مسلمانوں کے تباہ حال گھرانوں کے ساتھ ساتھ دلّی کے مجلسی آداب اور تہذیبی اطوار کے لیے بھی ایک جائے پناہ کا کام دینے لگا تھا۔ اس تہذیبی احیا میں تین بڑے عناصر نے لکھنؤ کی تہذیب کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی تھی۔ ان میں سب سے اہم عنصر یہاں کی خوشحالی، دوسرے مذہب کا ایک خاص انداز اور تیسرے اودھ کی مقامی خصوصیات شامل ہیں۔

ایرانی نوواردوں میں سیّد امین نیشاپوری ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں ہندوستان آئے۔ یہ پہلے سربلند خان کے میر منزل ہو گئے اور بعد میں قطب الملک کے توسط سے شہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ ملا۔ پھر سعادت خاں کے خطاب اور ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری سے نوازے گئے۔ بعد ازاں ۱۷۲۰ء میں اپنے مربّی قطب الملک کے خلاف تحریکِ سازش میں شریک ہو گئے اور بیانہ کے مقام پر قطب الملک کے بھائی امیر الامرا سیّد حسین علی کو قتل کرا دیا۔ بادشاہ نے ایک عارضی دربار منعقد کر کے سادات کے قاتلوں کو انعامات دیے تو سعادت خاں پنج ہزاری پر منصب فائز ہوئے۔ وزیر السلطنت محمد امین کا انتقال پر انھیں بادشاہ نے آگرہ کا گورنر بنا دیا۔ اس کے کم و بیش دو سال بعد سعادت خاں برہان الملک کو آگرہ کے علاوہ اودھ کی صوبہ داری بھی دے دی گئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ صرف اودھ کے صوبہ دار رہ گئے۔

میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک اور اس کی سلطنتِ مغلیہ کے لیے خدمات اور کارناموں کی ایک جھلک درج ذیل اقتباس میں ملتی ہے:

> ”اودھ کی سلطنت میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک نے قائم کی تھی۔ انھوں نے ساداتِ بارہہ کی سرکوبی کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لئے بادشاہ دہلی کی طرف سے ۱۷۲۰ء میں انھیں پنج ہزاری منصب اور اکبر آباد کی صوبہ داری ملی لیکن تھوڑے دنوں بعد ان کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ جہاں اس زمانہ میں شیوخ نے مرکز سے سرکشی اختیار کر کے اپنی متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ برہان الملک نے شیوخ کا زور توڑا اور امن وامان قائم کر لیا اور نواب وزیر کہلانے لگے، ان کا تعلق ایران کے صفوی خاندان سے تھا اس لئے عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے۔
> برہان الملک نے اجودھیا کے قریب، ایک شہر آباد کیا جس کا نام فیض آباد رکھا اور اسی کو پایۂ تخت بنایا۔“(۱)

اس وقت اودھ کا صوبہ پانچ سرکاروں (حویلی اودھ، گورکھپور، بہرائچ اور خیر آباد) پر مشتمل تھا، اس کی آمدنی ستّر لاکھ کے قریب تھی جو بعد میں سعادت خاں کے انتظام سے دو کروڑ سالانہ تک پہنچ گئی۔ آصف الدولہ کے عہد میں ریاستِ اودھ، بریلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد صرف تین صوبوں میں تقسیم رہی۔

ریاست اودھ اور اس کے والیان کے ضمن میں درج ذیل اقتباس قابلِ غور ہے:

> ”اودھ کے جس عہد کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں جو خاندان برسرِ اقتدار تھا اس کے بانی نواب محمد امین سعادت خاں برہان الملک نیشاپوری تھے جو حکومت دہلی کی جانب سے ۱۷۱۹ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد صفدر جنگ ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۷۵۳ء میں صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شجاع الدولہ نے اودھ کی زمامِ اقتدار سنبھالی۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ تھے جنہیں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے معزول کر کے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک ایک سو تین سال کے عرصہ پر ہمارا مطالعہ مشتمل ہے۔ اس عرصہ میں اودھ کی ثقافتی زندگی کا محور پہلے تو فیض آباد پھر لکھنؤ بنا۔ شجاع الدولہ نے بکسر کی شکست ۱۷۶۳ء کے بعد اپنے والد کی اتباع میں فیض آباد ہی کو دار الخلافہ قرار دیا اور اس کی تعمیر و ترقی میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو لگایا۔ ان کے انتقال ۱۷۷۵ء) کے بعد ان کے صاحبزادے آصف الدولہ نے بوجوہ لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ شجاع الدولہ نے جب زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اودھ کا علاقہ ۵ سرکاروں پر مشتمل تھا۔ حویلی اودھ، گورکھپور، بہرائچ، لکھنؤ، خیر آباد۔“(۲)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

لکھنوی تہذیب وثقافت ، کلچر اور تمدن، لکھنؤ کے محلوں، سڑکوں، گلیوں، منڈیوں، بازاروں، چوکوں، اشیا کی قیمتوں اور ارزانی، عمارات، باغات، ذرائع نقل وحمل، محلات، محل سراؤں، ڈیوڑھیوں، وضع قطع، رہن سہن، خانگی زندگی، ملازمین ومقربین، دربار، بیرونی معاشرت، دستر خوان، لباس، بعام، ذریعۂ معاش، عوام وخواص کے میں بٹیر بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، میلے اور دیگر تفریحی اجتماعات، طوائف بازی میں زنانِ خانگی، زنانِ بازاری اور ڈیرے دار طوائفوں، فنونِ لطیفہ میں رقص وموسیقی، مصوری وخطاطی، شناوری وغوطہ خوری، علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں، قدیم عزاداری، فن کاریوں، صنعت کاریوں، محلات کی زندگی، شادی وغم کی تقاریب اور پست طبقہ کے عوام کے رہن سہن، طرزِ زندگی اور ان کے مالی حالات پر مشتمل ہے۔

اودھ کی کثیر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ باقی لوگ مسلمان تھے جن میں اکثریت سنّی فرقے کی تھی۔ حکمران خاندان کا مذہب شیعہ ہونے کی وجہ سے دربار اور شہر میں شیعی رسم ورواج اور شیعی انداز زندگی کے فروغ پانے کے امکانات روشن ہوگئے تھے۔ سلطنتِ دہلی کی مرکزیت کمزور پڑنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ شخصی قانون اور شیعہ فقہ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس عہد تک شیعہ عقیدہ ورجحان رکھنے والے بھی نمازِ جمعہ وجماعت، نکاح وطلاق، تجہیز وتدفین اور قانونِ وراثت وغیرہ میں فقۂ حنفی کی قانوناً اور رواجاً پیروی کرتے تھے۔ پہلے دو صوبہ داروں یعنی برہان الملک اور صفدر جنگ کے عقیدۂ تشیع کے باوجود فقۂ جعفریہ کی ترویج اور شیعہ نظامِ معاشرت وتمدّن کی تشکیل نہ ہو پائی تھی۔

لکھنؤ میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں بولی جاتی رہیں لیکن اردو کو یہاں صدیوں سے خاص اہمیت حاصل رہی ۔ جب دہلی کے حالات بگڑے تو بہت سے شاعروں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ تب سے اردو شاعری کے دو ٹھکانے ہوگئے، دہلی اور لکھنؤ۔ دہلی صوفی شاعری اور لکھنؤ غزل، عیش وآرام اور عشقیہ شاعری کا مرکز بنا۔ نوابوں کے دورے میں اردو کی خصوصی نشو ونما ہوئی اور یہ ایک خاص تہذیب کی نمائندہ زبان کے طور پر ابھری۔ یہاں کے مشہور شاعروں میں حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، امیر مینائی، مرزا محمد ہادی رسوا، مصحفی، انشا، صفی لکھنوی، میر تقی میر شامل ہیں۔ لکھنؤ شیعہ ثقافت کے حامل عظیم شہروں میں سے ایک ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی اردو مرثیہ گوئی مشہور ہے۔

خالص لکھنوی تہذیب میں بول چال خاص اہمیت کی حامل تھی۔ چناں چہ آداب، تسلیم، تسلیمات، بندگی، کورنش، مجرا جیسے الفاظ ''عرض ہے'' یا بجالاتا ہوں'' کے ساتھ مستعمل تھے۔ دیگر الفاظ وتراکیب جیسے زندہ رہو، سلامت رہو، خوش رہو، عمر دراز ہو، صاحبِ اقبال ہو، مزاج شریف، مزاج مبارک، مزاج گرامی، مزاج مقدس، مزاج عالی، اچھا ہوں، الحمدللہ، آپ کی عنایت، خیریت ہے، آپ، تم، جناب عالی، جناب، جنابِ والا، عالی مرتبت، ولی نعمت، فیض گنجور وغیرہ لکھنوی تہذیب کے لیے خاص تھے۔

فرنگی محل، خاندانِ اجتہاد، سلطان المدارس، نویستہ، جھوائی ٹولہ، اودھ پنچ اور مطبع نول کشور جیسے مراکز علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ ادبی اور ثقافتی اجتماعات میں مشاعرے، صوفیائے کرام کے مزارات اور مجالسِ مرثیہ خوانی کا ذکر ضروری ہے۔ قدیم عزاداری کے ضمن میں محرم وچہلم، شاہی اور عوامی تعزیے، محرم اور چہلم کے جلوس، مجالس وخواندگی اور تقسیم تبرک اہمیت کے حامل ہیں۔

سعادت علی خاں کے عہد سے انگریزی کھانے کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ بشپ ہیبر نے غازی الدین حیدر کی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے جس کا انتظام مشرقی انداز پر دستر خوان کے بجائے انگریزی طرز میں انگریزی فرنیچر اور انگریزی اور چینی برتنوں کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی میں پلاؤ اور کباب وغیرہ کے علاوہ قہوہ، چائے، مکھن اور انڈا وغیرہ موجود تھے۔

رئیسوں کے دستر خوان میں صبح سویرے چائے کی پیالی کے ساتھ دو بسکٹ، ناشتا میں ہلکی مقوی غذائیں، پھر دوپہر کا کھانا اور شام کو چائے ہوتی۔ بالائی کی برف اور برف ملائی دوپہر کو لوگ لگاتے تھے۔ چوک بازار میں بیسویں صدی کی ابتدا تک عبداللہ کی دکان کی پوری کچوریاں، سعادت کی شیر مالیں اور گاؤزبانیں، احمد کی باقر خانیاں، شبراتی کے اٹھارہ پرتوں والے پراٹھے، شاہد کا بٹیر پلاؤ، جمّن کا مرغِ مسلم، ٹنڈے کے کباب، حیدر حسن خاں کے پھاٹک سے متصل گلی والا انناس کا فرعفرہ، کپتان کے کنویں والی برفیاں اور دیگر بہت سی مرغوب غذائیں ملتی تھیں۔ مرزا محمد عباس علی خاں کے دستر خوان کی ''بڑی روٹی''، قورمہ، قیمہ، دوسرے سالن اور ترکاریاں بھی ان دستر خوانوں کی زینت تھیں۔ غذاؤں کی بنیادی اجزا روٹی، سالن، دال اور چاول تھے۔ عوام میں جاڑے کے موسم میں شب دیگ ایک دوبار سادہ گوشت میں پکتی جس میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

عزیز واقارب اور دوستوں کو بلایا جاتا جب کہ روؤسا کے ہاں تیتر، بٹیر، ہریل، مرغ اور دوسرے پرندوں کے ملے جلے گوشت سے کئی بار شب دیگ تیار ہوتی۔ بادام کی گری، بالائی اور زعفران اس غذا کو معطر بنا دیتے:

> ''جاڑے کے موسم میں قریب قریب ہر گھر میں دو ایک بار پکتی تھی جن کو مقدرت نہ ہوتی ان کی تواضع ہمسایہ والے کر دیتے تھے۔ روساوامرا کے یہاں موسم سرما میں کئی ایک بار شب دیگ پکوائی جاتی اور عزیزوں نیز دوستوں کی ضیافت ہوتی تھی۔ روسا کے یہاں سادے گوشت کے بجائے تیتر، بٹیر، ہریل، مرغ اور دیگر پرندوں کا ملا جلا ہوا گوشت استعمال ہوتا تھا بادام کی گری، بالائی اور زعفران کی شمولیت اس غذا کو بے حد لذیذ اور بہت معطر بنا دیتی تھی۔ یہ غذا لذیذ، زود ہضم، مصلح معدہ و جگر۔ مولدِ خون صالح اور مقوی اعضائے رئیسہ سمجھی جاتی تھی۔''(۳)

مرزا جعفر حسین کی تالیف ''لکھنؤ کا دستر خوان'' میں بیان کی گئی کھانوں کی طویل فہرست میں سے ''پلاؤ'' کی اقسام کی فہرست اہلِ لکھنؤ کی نفاست کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''باب نہم: پلاؤ: سادہ پلاؤ: چلاؤ، طاہری، مٹر پلاؤ، باقلہ لاؤ، بوٹ پلاؤ۔
> گوشت والا: سادہ وُلاؤ، خاصگی پلاؤ، یخنی پلاؤ، بریانی، سوئیوں کا پلاؤ، بوقلموں پلاؤ، مرغ پلاؤ، انڈہ پلاؤ، مچھلی پلاؤ، پائے پلاؤ، پسندے پلاؤ، مٹر پلاؤ، گوشت والا، مٹر پلاؤ، کباب والا، مٹر پلاؤ گوشت در کباب والا، مٹر پلاؤ گوشت میوہ دار، باقلہ پلاؤ کباب والا، بوٹ پلاؤ کباب والا، پوسٹ پلاؤ، گوشت والا خاصگی۔''(۴)

پرندوں میں مرغ اور بٹیر کے علاوہ ہریل، تیتر، چھوٹی بط، چہے اور کہلگ شوق سے کھائے جاتے تھے۔ بط، چہے اور کہلگ دریائی پرندوں کی بساند دور کرنے کے لیے مسالوں کے وزن میں لہسن دونا اور دہی ڈیوڑھا کر دیا جاتا تھا۔ ان سب پرندوں کے کباب بننے کے علاوہ کبھی کبھی قورمہ تیار کیا جاتا تھا۔ مرغ اور دوسرے غیر دریائی پرندوں کی کھال اور آلائش دور کرنے کے بعد اندر اور باہر لہسن کے پانی اور پھر بیسن سے دو دو بار دھو لینا کافی ہوتا تھا۔ کبابوں کے لیے سب پرندوں کے مشترک مسالوں میں پرندوں کے ایک سیر گوشت کے واسطے لہسن کی ایک گٹھی، پیاز دو بڑی گٹھی، ادرک تین تولے، بھنا ہوا دھنیا چار تولے، مرچ سرخ تین تولے، جوز جوتری دو ماشے، تیز پات دو عدد، لونگ الائچی چھ عدد، ناریل ڈھائی تولے، خشخاش ڈیڑھ تولہ، بھنے چنے چھ تولے، زیرہ سیاہ بھنا ہوا تین ماشے، اور نمک ڈھائی تولے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر پرند کے کباب پکانے کے لیے ان مسالوں کو پہلے بہت باریک پیس لینا ضروری تھا۔ بٹیروں کے کبابوں کے واسطے گھا گر بٹیر فراہم ہوتے تھے۔ چھوٹی یعنی چنک بٹیر نیز چہے صرف قورمہ بنانے کے کام آتے تھے۔

گلوری بھی لکھنوی تہذیب کا اہم جزو تھا جس کے اجزا میں کتھہ، چونا، ڈلی، الائچی اور تمبا کو شامل ہیں۔

امرا اور رؤسا کے ساتھ تعلق کے باعث شرفائے لکھنؤ محنت و مشقت کو ننگ و عار کا موجب سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کے ذرائع معاش اور صنعتی فن کاریوں میں چکن و کامدانی و کارچوبی، تانبے، پیتل، لوہے اور مٹی کی برتن سازی کے کام شامل تھے۔ شعر و ادب، طب، وکالت اور ملازمت بھی معاش کے بڑے ذرائع خیال کیے جاتے تھے۔ فن کاریوں اور صنعت کاریوں کے ضمن میں چکن اور کامدانی، کارچوبی، سلمے ستارے کا کام، طلائی اور نقرئی زیورات، پیتل اور تانبے کے ظروف، مٹی کے برتن، کھلونے اور دیگر کئی ایک ایجادات و اختراعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سیاسی انتشار کے باوجود نوابین اودھ نے اعلیٰ تہذیبی روایات قائم کیں جن کی وجہ سے لکھنؤ آج دنیا میں خوب صورت عمارات، ہندو مسلم یکجہتی اور اعلیٰ ثقافتی کارناموں کے لیے مشہور ہے، رجب علی بیگ سرور کا یہ شعر لکھنؤ پر صادق آتا ہے:

سنا رمنواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

" لکھنؤ کی تہذیب اپنی جگہ پر ایک ایسی حسین و جمیل اور پُر کیف دنیا تھی جس کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں بسایا اور آباد کیا گیا تھا۔ ان حکمرانوں نے اس کی بنیاد کچھ ایسی ہنر مندی اور اتنے خلوص وانہماک سے رکھی تھی کہ انتزاعِ سلطنت کے تخمیناً اسی برس بعد تک اس کے آثار موجود تھے" ۔(۵)

رؤسا اور عمائدین کی وضع قطع الگ الگ تھی۔ کچھ لوگ سروں پر پٹے رکھتے۔ بعض خشخشی بال کٹواتے۔ لوگ ڈاڑھی مونڈتے تھے لیکن بڑی بڑی اور مشین مونچھیں رکھتے۔ بعض رئیس تو گل مچھے رکھواتے اور بڑی بڑی اور چوڑی چوڑی قلمیں کتر واتے۔ سرمہ لگانے کا عام رواج تھا اور عطر لگانا برکت کا باعث اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

لباس میں عام طور پر سروں پر دوپلّی، کشتی نما، چوگوشیا یا قبہ دار ٹوپی رہا کرتی۔ بعد ازاں ترکی اور ابراتی ٹوپیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ ہندو امرا کو بانات کی گول ٹوپیوں کی عادت تھے۔ جسم پر کرتا اور چیکن یا انگرکھا (دگلا) پہنا جاتا۔ بنیان کا وجود نہ ہونے کے باعث صدریاں پہنی جاتیں۔ موسمِ گرما میں چکن یا جامدانی کے انگرکھے اور موسمِ سرما میں جامہ وار کی چکن یا چکن اور مہرمات کے انگرکھے شانِ امارت سمجھے جاتے تھے۔ شادی بیاہ یا دیگر خوشی کی تقریبات میں اطلس وزربفت استعمال کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں چیکن کی جگہ اچکن نے لے لی۔ گلے میں ریشمی رومال پڑے رہتے۔

آرائش وزیبائش کے ضمن میں تموّل اور رنگین مزاجی کے باعث جواہرات، شیشہ آلات اور رنگ برنگ پچی کاریوں کا شوق تھا۔ رئیسوں کے ہاتھوں میں کم از کم پانچ ورنہ سات انگوٹھیاں پہنی جاتیں۔ بعض لوگ دو دو انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ ان انگوٹھیوں میں فیروزہ، عقیق، یاقوت، زمرد، زبرجد بہت پسند کیے جاتے تھے۔ انگوٹھیاں چاندی کی بنتی تھیں۔ نیلم کو مبارک یا منحوس سمجھ کر پس وپیش سے کام لیا جاتا۔ ہیرا عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ مرد سونا نہیں پہنتے۔

عورتوں کا لباس تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ ہندوستان کے ہر حصے میں قدیم زمانے سے ایک جیسا رائج تھا یعنی سر پر دوپٹہ، سینہ پر تنگ محرم اور پیٹ اور پیٹھ پر ایک خاص قطع کی کرتی مگر لکھنؤ میں دوپٹہ، محرم اور کرتی۔ جوتوں میں دلّی کی سلیم شاہی وضع سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوا تھا البتہ سُکی، نرمی، آرائش وزیبائش وغیرہ۔ لکھنؤ کے معروف خرودونوکے، جوتے، مخمل، کمخواب، بانات، زربفت اور کیمخت وغیرہ کا حسین ونازک کام کام ہوتا تھا۔ اودھ کی عورتوں کی شکل وصورت اور خدّوخال کی دلکشی کا اعتراف مسز کڈر سلے نے بھی اپنے خطوط میں کیا ہے۔ آنکھوں میں خطوطِ سرمہ کی گوشۂ چشم کے باہر تک کشیدگی، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، دانتوں میں مسّی کا اوداپن، ہاتھ پیروں کی ہتھیلیوں اور ناخنوں میں حنا کی سرخی اور اس میں نفاست کے ساتھ کچھ نقش ونگار، زیورات میں سر پر سنگارپٹی، مادھے پر بینا اور جھومر کانوں میں بالیاں، بجلیاں کان چین، بُندے اور پتّے، گلے میں تلسی، مالا، گلوبند، چمپاکلی، جگمگااور ہار، بازوؤں میں جوشن اور نونگے، ہاتھوں میں کرے چوڑیاں، جہانگیریاں، پہنچیاں، کنگن اور علی بند، انگلیوں میں آرسی، چھلّے اور انگشتریاں، پیروں میں بل، جھانوریاں، کرے، چاند توڑے، چھاگل، پازیب، کشتیاں اور رام جھول وغیرہ شامل ہیں۔ امیر عورتوں کے ان زیورات میں قیمتی موتی، زمرآد، ہیرے، نیلم اور پکھراج وغیرہ جڑاؤ کا کام ہوتا تھا جن کی وجہ سے ان کی تاب وتابش میں نمایاں اضافہ ہو جاتا تھا۔

محلات کی زندگی میں خانگی ماحول، انتظامِ خانہ داری، رہن سہن، بیگمات کا ذوق وشوق، ملازماؤں کا عملہ، زچّہ خانہ اور تربیت وتعلیم اطفال کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔(۶)

لکھنؤ کی اہم عمارات میں آصف الدولہ کا عالی شان محل "دولت کدہ"، بیبیاپور کا محل، چھنٹ میں کوٹھی "نزہت بخش"، بڑاامام باڑہ اور اس میں موجود آصف الدولہ کا مقبرہ، رومی دروازہ، چار باغ میں نوابانِ شیش محل کے مورثِ اعلیٰ نواب حکیم مہدی کا محل، لامارٹینز کی عمارات میں مارٹن صاحب کی کوٹھی، لامارٹینز کالج، نواب سعادت علی خاں کی کوٹھیاں "فرحت بخش" اور "حیات بخش"، انگریز ریذیڈنٹ کے قیام کے لیے "ٹیڑھی کوٹھی" دل آرام کوٹھی، دل کشا کوٹھی، کوٹھی نور بخش، خورشید منزل، غازی الدین حیدر کا تکمیل شدہ "موتی محل"، شاہِ نجف، نصیرالدین حیدر کی تعمیر "کربلاڈالی گنج پار"، محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ "چھوٹاامام باڑہ" اور واجد علی شاہ کی تعمیرات "چھتر منزل" اور "قیصر باغ" شامل ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے بعد فنِ تعمیر کی تبدیلیوں اور انگریزی فن تعمیر کی تقلید کے حوالے سے یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

"نواب آصف الدولہ کے بعد اودھ کے فن تعمیر کا مذاق بالکل بدل گیا تھا اور اب وہ زمانہ شروع ہو گیا تھا کہ جب یورپی اندازِ تعمیر کی تقلید میں عمارتیں بلحاظِ صلابت کمزور اور بلحاظِ ضرورت مفید تر بنائی جانے لگی تھیں۔ اس تبدیلیِ مذاق وانداز کا ذمہ دار اودھ میں دو عملی حکومت، سعادت علی خاں کی جُزرَسی اور انگریزی اثرات کی افراط کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

تونواب نے جنرل مارٹین کی کوٹھی کو جسے اب چھترمنزل کہتے ہیں پچاس ہزار روپے میں خرید کر اُس کا نام فرح بخش رکھا۔ پھر ٹیڑھی کوٹھی شہزادۂ سلیمان شکوہ سے لے لی اور دلآرام، دلکُشا، حیات بخش وغیرہ کوٹھیاں اور لال بارہ دری، خورشید منزل اور منوّر بخش وغیرہ عمارتیں خود تعمیر کرائیں۔ اس میں قدیم ہندوستانی وضع ترک کر کے یورپ کے اندازِ تعمیر کی تقلید کی گئی تھی۔ اس کوشش امتزاجِ رنگ میں نہ یہ عمارات ہندوستانی رہیں اور نہ خالص یورپی۔ بلکہ ان میں دونوں خصوصیات کا ایک ملا جلا انداز پیدا ہو گیا جو اپنی کمزوریوں کے باوجود حسن و زیبائش سے خالی نہیں ہے۔"(۷)

شہرِ لکھنؤ کے باغات اور مرغزاروں میں چار باغ، نظر باغ، عیش باغ، عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، ڈالی باغ، بندر یا باغ، بنارسی باغ، بادشاہ باغ، بادشاہ باغ کی بارہ دری، کمپنی باغ اور یگر کئی باغات اہمیت رکھتے ہیں۔

عمارات اور باغات کے ضمن میں مرزا جعفر حسین کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"لکھنؤ کو باغوں اور مرغزاروں کا شہر کہا جاتا تھا۔ فرمانروایانِ اودھ کو خوشنما باغات لگانے اور بلند و بالا، حسین و جمیل مستحکم واستوار عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ آصف لدولہ نے لکھنؤ آتے ہی اپنے عالیشان محل موسومہ "دولت خانہ" میں اقامت فرمائی تھی۔ یہ محل مچھی بھون قلعہ کے نزدیک تیار کرایا گیا تھا۔ مچھی بھون کا قلعہ مسمار ہو گیا لیکن "دولت خانہ" در و دیوارِ شکستہ کی شکل میں اب تک موجود ہے اور شیش محل کے نام سے موسوم ہے۔"(۸)

محلوں میں شیخن محلا، پنچ محلا، مبارک محلا اور دیگر برائے نام باقی ہیں۔ سڑکوں میں مال روڈ، وکٹوریہ سٹریٹ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اہم گلیوں میں کٹرہ والی گلی، شاہ گنج کی گلی، ٹوریہ گنج کی گلی شامل ہیں۔ ڈالی گنج پار، سعادت گنج اور محلہ رکاب گنج کی منڈیاں تھوک فروشی کا مرکز ہیں۔ بازاروں میں عیدگاہوں میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے مواقع پر، عاشورۂ محرم اور چہلم کے دن کربلائے تال کٹورہ میں اور ہر میلے کے مخصوص مقامات جیسے بالے میاں کی یا وکٹوریہ سٹریٹ پر، ہولی کے دن گول دروازے کے مقابل وکٹوریہ پارک میں، نہان کے دن دریا کے قریب والی سڑک پر لگنے والے بازار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پرانے لکھنؤ کا قدیم چوک (لکھنوی تہذیب وثقافت کا مرکز) بہت مشہور ہے۔ رائج الوقت سکوں میں پیسوں کے علاوہ دھیلے، دمڑیاں اور کوڑیاں شامل تھیں۔

اودھ کے باشندے اپنی عادات واطوار کے حوالے سے نرم مزاج، پُرتامل اور مہمان نواز رہے ہیں اور مسز کنڈر سلے، جارج فورسٹر، ولیم ہوجز وغیرہ نے ان کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر رئیس کے ہاں ملازمین میں مولوی، اطبا، شعرا، خزانچی، محاسب، میر منشی اور پیش کار موجود رہتے تھے۔

معاشی فارغ البالی کی وجہ سے والیانِ ریاست میں جمال پرستی اودھ کے لیے اس طرح مخصوص ہو کر رہ گئی کہ زنانِ بازاری سے اختلاط عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورت ہر صاحبِ ثروت کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ محفلوں سے نکالی گئی اور آبرو باختہ طوائف مہمانوں کے استقبال اور بچوں کی تربیت کے لیے عام طور پر ملازمہ رکھی جاتی تھی۔ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک بہ استثنائے امجد علی شاہ کون شخص تھا جسے حسن پرستی کے جذبے سے بیگانہ سمجھا جائے۔ رؤسا اور عمائدین کے طرز زندگی سے ڈیرے دار طوائفیں بہت زیادہ متاثر تھیں۔ انتہائی صاف ستھرے کپڑے پہننا، پورے جسم کا بجز چہرے، گٹوں تک ہاتھ اور پیروں کا ڈھکا رہنا، شرافت ومتانت سے گفتگو کرنا، تہذیب واخلاق کا ہر موقع و محل پر لحاظ رکھنا، تمام رفتارِ گفتار میں شائستگی برقرار رکھنا ان کے لیے ضروری تھا۔ یہ تعلق جنسی لگاؤ سے بے نیاز تھا۔

سواری کے طور پر یکے، بند شکرم گاڑیاں شہر میں چلتی تھیں۔ رؤسا اور عمائدین عمدہ اور زرق برق چوپہلوں اور فینسوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے، مستورات ڈولیوں، چوپہلوں اور فینسوں پر نکلتی تھیں جب کہ انگریز دور میں دو ایک گاڑیاں اور عوامی سطح پر یکے رتھ اور بیل گاڑیاں بھی ذرائع نقل وحمل کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

اودھ کی مصوری کے نمونے یا ان کی نقلیں لکھنؤ میوزیم، شاہ نجف، امیر الدولہ لائبریری اور بعض تعلقہ دارانِ اودھ کے مکانوں میں دیکھ کر اس عہد کے موضوعاتِ تصویر اور اسلوبِ قلمکاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان تصاویر میں پس منظر کے طور پر آسمان پر رنگ برنگی بدلیاں دکھائی جاتی تھیں۔ عموماً کسی پرندے کی پرواز کا اہتمام بھی ہوتا تھا زمین پر ایک بُرجیوں دار دیوار پھولوں سے مزیّن رکھی جاتی تھی۔ تصاویر کے عام موضوعات بادشاہ اور امرائے دولت کی شبیہیں، شاہی عمارات کے نقشے، جلسہ وجلوس

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

،محلّات اور دربار کے مناظر، کسی امیر کے خانگی مشاغل، رقص و سرود کی محفلیں، ساون کی بہاریں، میدانِ جنگ کے سین، گھمسان کی لڑائیاں، سیر و شکار کی دلچسپیاں، جنگلات میں جانوروں کے جھرمٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ تصویریں کاغذ اور کرمچ یعنی ولائتی ٹاٹ کے علاوہ شیشہ، ابرق، اخروٹ، ہاتھی دانت اور ظروف پر بھی بنائی جاتی تھیں۔

اودھ میں بھی بہت سے نامور خطّاط پیدا ہوئے جو عموماً آغا عبدالرشید ویلمی کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں تین ماہر خطّاط یعنی حافظ نوراللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباداللہ بیگ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں بھی آئے تھے۔ شجاع الدولہ کے دور میں جواہر علی خاں (خواجہ سرا) کے متوسّلین میں محمد خلیل ایک کامل خوشنویس فیض آباد میں مقیم تھا۔

موسیقی کا شوق بھی شاہانِ اودھ میں شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان بھر سے عموماً اور تان سین کے دبستانِ موسیقی کے ماہر مطرب و رقاص خاص طور پر فیض آباد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ اجودھیا، بنارس اور جون پور کے وہ فن کار بھی کلاسیکی رقص و موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ ان سب کے باہمی ربط و اتصال اور اشتراک سے اودھ میں موسیقی کی ایک نئی روایت قائم ہوئی تھی جس نے آصف الدولہ کے عہد میں زیادہ عروج حاصل کیا تھا۔ چنانچہ انہی نواب وزیر کی حوصلہ افزائی سے فنِ موسیقی کی لاجواب کتاب ''اصول النغمات الآصفیہ'' وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں نواب سالار جنگ علمِ موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کے علاوہ بعض طوائفیں جیسے بڑی مصری، سُندر جان، نجبن، سلارو، کریم بخش، رادھا اور متھو وغیرہ شامل ہیں۔ سعادت علی خاں کے عہد میں پرکاش نامی ایک باکمال شخص اپنے فن والوں پر سبقت لے گیا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ میں ایک زبردست موسیقی دان حیدری خان کے علاوہ رجب علی اور فضل علی دو درباری قوّال اور سہڑو بائی طوائف (جو دکن سے آکر شاہی ملازمین میں شامل ہو گئی تھی) اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ چھجّو خان اور غلام رسول خان کے علاوہ دو اور قوّال بھی بہت مشہور ہوئے تھے۔ ''شوری'' کو ٹپے کا موجد مانا گیا ہے۔ واجد علی شاہ کا درباری مغنّی قطب علی خاں فنِ موسیقی اس قدر جانتا تھا کہ نانک بیجو، ناناک گوپال اور تان سینِ وقت تھا۔ ان کے علاوہ ثابت علی اور چھجّو دو مشہور سازندے چھوٹے خان طبلہ باز اور غلام رضا، محمد حسن خاں، حیدر علی، نثار علی اور خواجہ بخش خان بھی ولی عہد کے ملازم تھے جن میں پیار خان، جعفر خان، حیدر خاں، باسط خاں اور محمد علی خاں نے علم موسیقی پر تین کتابیں ''ناجو''، ''بنی'' اور ''دُلہن'' تصنیف کی تھیں جن میں سے ''بنی'' زیادہ مشہور ہے۔

لکھنوی دربار کے جملہ ذرائعِ تفریح میں درندوں، چوپایوں اور پرندوں کی معرکہ آرائیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ درندوں اور چوپایوں میں شیر، چیتے، تیندوے، گینڈے، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، مینڈھے اور بارہ سنگھے جیسے جانوروں کو لکھنؤ دربار میں ہم جنس اور غیر جنس دونوں سے لڑایا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> '' لکھنؤ میں غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالباً ان کے یورپین دوستوں نے درندوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا، بادشاہ فوراً آمادہ ہو گئے'' ۔(۹)

جہاں تک پرندوں کی بات ہے تو اس سلسلے میں بھی لکھنؤ کا امتیاز و اس کی انفرادیت مشہورِ عالم ہے۔ مرغ اور بٹیر کی لڑائی تو مشہور تھی ہی لیکن تیتر، لوے، گُلدُم، لال، کبوتر اور توتے جیسے معصوم پرندوں کی باضابطہ معرکہ آرائیاں چشمِ فلک نے لکھنؤ سے پہلے شاید کہیں اور کبھی نہیں دیکھی ہوں گی۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائیوں کا سلسلہ غازی الدین حیدر کے بعد تقریباً ناپید ہو گیا۔ شاید بعد کے شاہان یا تو اس طرح کے باذوق ثابت نہیں ہو پائے یا اس ذوق طرح کی نزاکتوں کے متحمل نہ ہو سکے۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ عبدالباری، سیّد، لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، مئی ۱۹۸۷ء، ص ۳۸

۲۔ محمد شفیع شیرازی، میرزا، معرکۂ چکبست و شرر یعنی مباحثہ گلزارِ نسیم، مرتبہ: امیر حسن نورانی، لکھنؤ، نسیم بکڈپو، مارچ ۱۹۶۲ء، ص ۸

۳۔ شہناز بیگم، ڈاکٹر، اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی، نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۹

۴۔ جعفر حسین، مرزا، لکھنؤ کا دسترخوان، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکاڈمی، ۱۹۸۰ء، ص ۶۔۴

۵۔ جعفر حسین، مرزا، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸، ص ۸

۶۔ مرزاجعفر حسین،قدیم لکھنؤکی آخری بہار ، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۱۹۹۸، ص ۳۳

۷۔ صفدر حسین،ڈاکٹر سیّد،لکھنؤکی تہذیبی میراث(تاریخ،تمدّن اور تہذیب)، لکھنؤ،اردو پبلشر،۱۹۷۸ء، ص۳۵۔۲۳۴

۸۔ شہناز بیگم،ڈاکٹر،اردوشاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی، نئی دہلی،انجمن ترقی اُردو(ہند)،۲۰۰۴ء، ص۱۸۸

۹۔ لکھنوی،عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،۲۰۱۱ء، ص۱۹۴